6

اسلام کی نئی اور مضبوط دیواریں کھڑی کی جارہی ہیں

(فرمودہ 5فروری 1943ء)

تشہد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:

"اِس ہفتہ میں ایک ایسا واقعہ ہؤا ہے جس نے ہندوستان میں ایک ہیجان پیدا کر دیا ہے۔ اور وہ واقعہ وہ سوال و جواب ہیں جو تُرکی وفد اور ہندوستانی پریس کے نمائندوں کے درمیان لاہور میں ہوئے۔ ترکی وفد نے جو جوابات دیئے ہیں یا جن جوابات کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے دیئے ہیں وہ ایک طرف تو اسلام کے دشمنوں کے لئے خوشی کا موجب ہوئے ہیں اور دوسری طرف مسلمانوں کے ایک حصہ کے لئے افسوس اور دوسرے حصہ کے لئے پریشانی کا موجب ہوئے ہیں۔ ہندو اخبارات نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ تُرک اسلام سے بیزار ہیں اور دوسرے یہ کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاست سے اُن کو اختلاف ہے۔ جہاں تک سیاست کا تعلق ہے ہمیں اس سے زیادہ دلچسپی نہیں کیونکہ ہمارے نزدیک سیاسیات میں جس رنگ میں اِس وقت حصہ لیا جارہا ہے، خواہ ہندوؤں کی طرف سے ہو اور خواہ مسلمانوں کی طرف سے، خواہ ہندوستان کے لوگوں کی طرف سے ہو اور خواہ ہندوستان سے باہر رہنے والے لوگوں کی طرف سے، وہ سب کا سب غیر معقول اور خطرناک ہے۔ اگر سیاست دنیا میں کوئی مفید چیز ثابت ہونا چاہتی ہے تو ضروری ہے کہ سیاسی لوگ سیاست میں بھی اخلاق کا اتنا ہی حصہ تسلیم کریں جتنا کہ انفرادی زندگی میں اس کا حصہ تسلیم کرتے ہیں۔ مَیں نے تسلیم کرنے کے

الفاظ اس لئے استعمال کئے ہیں کہ اِس زمانہ میں گو اِنفرادی زندگی میں بھی لوگ اخلاق کا اتنا خیال نہیں رکھتے جتنا خیال اُنہیں رکھنا چاہیئے۔ مگر کم سے کم مُنہ سے ضرور تسلیم کرتے ہیں کہ ہماری شخصی زندگی پر اخلاق کی حکومت ہے۔ لیکن جب ایک طرف وہ اس انفرادیت کی حالت میں اعلیٰ اخلاق کی ضرورت کو تسلیم کرتے اور انہیں جامۂ عمل پہنانے کی حتی الامکان کوشش کرتے ہیں وہاں دوسری طرف علی الاعلان علمی بحثوں میں بھی اور عملی حالتوں میں بھی تمام سیاسی لوگ اعلیٰ اخلاق کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ حالانکہ جس طرح ایک شخص اپنی فردی زندگی میں اخلاق کی حکومت کو تسلیم کرتا ہے۔ اسی طرح اگر سیاسیات میں بھی اعلیٰ اخلاق کو اپنے اوپر حاکم قرار دیا جائے تو بہت سے جھگڑے اور فسادات جو آج نظر آرہے ہیں بالکل دور ہو جائیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ جن باتوں کو فرد اپنی شخصی زندگی میں ناجائز قرار دیتا ہے انہی باتوں کو سیاستدان اپنے سیاسی کاموں میں جائز سمجھتے ہیں۔ یہ روزمرہ کے فسادات جو ملک میں دکھائی دیتے ہیں کہ کہیں گاؤکُشی پر جھگڑا ہو جاتا ہے، کہیں مسجد کے سامنے باجا بجانے پر کُشت و خون شروع ہو جاتا ہے۔ یہ زندہ مثالیں ہیں اس بات کی کہ کس طرح ایک دوسرے کے حقوق کو ہمارے ملک میں پامال کیا جاتا ہے۔ ان تمام جھگڑوں اور مناقشات کی اصل وجہ یہی ہے کہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ قوم کی ترقی کے لئے اگر جھوٹ بول لیا جائے یا فساد برپا کر دیا جائے یا قتل و غارت کا ارتکاب کر لیا جائے تو یہ بالکل جائز ہوتا ہے۔ حالانکہ جس طرح ایک فرد کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی دوسرے کو مارے یا اس کے حقوق کو تلف کرے اسی طرح کسی قوم کے لئے بھی یہ جائز نہیں کہ وہ اپنی ترقی کے لئے دوسروں کو مارے یا اُن کے حقوق کو تلف کرے۔ جس طرح ایک فرد کو یہ حق حاصل نہیں کہ اگر اس پر کسی نے ظلم کیا ہو تو وہ ظالم کو اس ظلم کی خود ہی سزا دینی شروع کر دے۔ اگر کوئی قاتل ہو تو اسے قتل کر دے یا چور ہو تو اسے اپنے ملک کے دستور اور قانون کے مطابق سزا دے۔ اسی طرح ایک قوم کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ اگر اس پر ظلم کیا جائے تو اس ظلم کے ازالہ کے لئے جو قانونی علاج مقرر ہو اس کو ترک کر کے ظالم کو خود ہی سزا دینی شروع کر دے۔ مگر دیکھا یہی جاتا ہے کہ دھینگا مُشتی سے، زور سے، آپ ہی آپ بغیر اس کے کہ قانونی طور پر جھگڑوں کا تصفیہ کرایا جائے اپنے

حقوق کو حاصل کرنے کے لئے ایسی جدوجہد کی جاتی ہے جو شرعاً اور اخلاقاً جائز نہیں ہوتی۔ حالانکہ اخلاق کی پابندی فرد اور قوم دونوں کے لئے ضروری ہے۔ جس طرح ایک فرد کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ اگر زید نے اس کے باپ کو مارا ہو تو وہ خود ہی اٹھ کر زید کو قتل کر دے یا زید کے علاوہ اس کے رشتہ داروں کو بھی جوشِ انتقام میں قتل کرنا شروع کر دے۔ اسی طرح ایک قوم کے لئے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ اگر اس پر حملہ ہو تو وہ جوشِ عداوت میں اخلاق کو نظر انداز کر دے اور حملہ آور کی قوم کے لوگوں کو قتل کرنا شروع کر دے۔ مگر ہم دنیا میں روزانہ دیکھتے ہیں کہ اگر کسی قومی مُناقشہ کی بِناء پر کسی مسلمان کے ہاتھ سے کوئی ہندو مارا جاتا ہے تو اس محلہ میں جو بھی مسلمان گزرتا دکھائی دے اسے ہندو مارنا شروع کر دیتے ہیں۔ اسی طرح اگر کسی ہندو کے ہاتھ سے کوئی مسلمان ایسے موقع پر مارا جائے تو ان کے محلہ میں سے جو ہندو بھی گزر رہا ہو اس پر حملہ کر دیتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا یہی قانون افراد کے متعلق نافذ کیا جاسکتا ہے اور کیا افراد کو اس بات کی اجازت دی جا سکتی ہے کہ اگر ان میں سے کسی فرد کو دوسری قوم کا کوئی شخص مار دے تو اُنہیں اس بات کا حق حاصل ہے کہ اس قوم کا انہیں جو شخص بھی دکھائی دے اسے قتل کر دیں۔ اگر افراد کو اس بات کی اجازت نہیں دی جا سکتی تو قوم کو اس بات کی اجازت کس طرح حاصل ہو سکتی ہے۔ اور اگر افراد اخلاق کے پابند ہیں تو قوم کیوں اخلاق کی پابند نہیں سمجھی جا سکتی۔ مگر باوجود اس کے کہ اخلاق کی جس طرح فردی زندگی میں ضرورت ہے اسی طرح قومی زندگی بھی اخلاق کے بغیر درست نہیں ہو سکتی۔ سیاسیات میں اس بات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور صراحتاً اپنے مفاد کے لئے جھوٹ بولا جاتا ہے۔ جنگیں ہوتی ہیں تو ایسی ایسی خبریں ایک دوسرے کے متعلق شائع کی جاتی ہیں جن میں ذرا بھی اصلیت نہیں ہوتی۔ ہم ہندوستان میں رہتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ یہاں کی کیا حالت ہے۔ ملک میں فسادات ہو رہے ہیں یا نہیں ہو رہے مگر حالت یہ ہے کہ ہم جب اپنے آپ کو بالکل امن میں دیکھ رہے ہوتے ہیں اس وقت دشمن اس قسم کی خبریں پھیلا رہا ہوتا ہے کہ ہندوستان میں بڑے بھاری فسادات ہو رہے ہیں۔

مَیں نے خود ایک دفعہ جرمن ریڈیو کو یہ اعلان کرتے سنا کہ آجکل ہندوستان میں

سخت فسادات برپا ہیں اور گورنمنٹ کے خلاف لوگ بغاوت کر رہے ہیں۔ اب یہ ایک صریح جھوٹ تھا جو جرمن ریڈیو پر بولا جارہا تھا مگر باوجود اس کے کہ یہ کھلا اور بیّن جھوٹ تھا۔ جرمن ریڈیو پر بولنے والا اور جرمن حکومت دونوں یہ سمجھتے تھے کہ یہ ہے تو جھوٹ مگر سچ سے زیادہ قیمتی ہے کیونکہ اس سے ان کی قوم کو فائدہ پہنچتا ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جبکہ ابھی گاندھی جی پکڑے نہیں گئے تھے اور ملک میں فسادات شروع نہیں ہوئے تھے۔ مَیں یہ نہیں کہتا کہ صرف جرمن والے ایسا کرتے ہیں، مقابل کی حکومتیں بھی ایسا ہی کرتی ہیں۔ نہ مَیں اس سے انگریزوں اور امریکنوں کو بَری سمجھتا ہوں، نہ جرمنوں اور اطالویوں کو بَری خیال کرتا ہوں۔ یہ ساری قومیں سیاسیات میں اخلاق کو نظر انداز کر دیتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ اگر کسی خبر سے ملک کو فائدہ پہنچتا ہو تو گو وہ غلط ہی ہو اُسے بیان کر دینے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔ لیکن دنیا میں کبھی امن قائم نہیں ہو سکتا جب تک اس رویہ کو نہ بدلا جائے۔ دنیا میں امن کے قیام کا ذریعہ صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنے سامنے چند اصول رکھیں جو بالکل صحیح اور درست ہوں اور پھر اپنی قومی، اخلاقی اور فردی زندگی کو اُن اصول کے تابع کر دیں۔ تا ہم میں سے ہر شخص جانتا ہو کہ دوسرا شخص کس قسم کا معاملہ کرے گا اور اس کے دل میں کسی قسم کی گھبراہٹ نہ پیدا ہو۔ اگر ہر شخص جانتا ہو کہ دوسرے لوگ ضابطۂ اخلاق کے پابند ہیں اور وہ ان اصول کو کبھی نظر انداز نہیں کریں گے جو اس غرض کے لئے مقرر ہیں تو دشمن کے ملک میں بھی رہ کر اس کا دل مطمئن ہو گا اور وہ سمجھے گا کہ یہ لوگ مجھ پر کوئی جھوٹا الزام نہیں لگا سکتے۔ لیکن اگر ہر شخص اپنے دل میں ڈر رہا ہو کہ گو مَیں نے کوئی جرم نہ کیا ہو لیکن چونکہ مَیں فلاں ملک میں رہتا ہوں جو میرے ملک کا دشمن ہے یا فلاں قوم کے درمیان آبسا ہوں جو میری قوم کی دشمن ہے اس لئے مجھ پر ہر قسم کے جرم کا الزام لگایا جا سکتا ہے تا کہ مجھے نقصان پہنچے۔ تو اس صورت میں امن کہاں حاصل ہو سکتا ہے اور کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ دنیا مہذب و متمدّن ہو گئی ہے۔

غرض سیاسی لحاظ سے ہمیں ساری دنیا سے اختلاف ہے۔ کسی سے کم اور کسی سے زیادہ۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ بعض زیادہ ظلم کرتے ہیں اور بعض کم ظلم کرتے ہیں لیکن

بہر حال اپنی سیاست اور قانون پر اخلاق کو حاوی کر لینے کا دستور ہم نے اس وقت تک کسی قوم میں نہیں دیکھا۔ باقی رہا مذہب، سو مذہب کے معاملہ میں انہوں نے جو کچھ کہا یا جو کچھ ان کے متعلق کہا جاتا ہے میرے نزدیک اس میں کچھ غلط فہمیاں ہیں اور کچھ غلطیاں۔ مثلاً کہا گیا ہے کہ تُرکی وفد نے اس سوال کے جواب میں کہ آپ پہلے مسلمان ہیں یا تُرک یا پہلے تُرک ہیں اور پھر مسلمان۔ یہ کہا کہ ہم پہلے تُرک ہیں اور بعد میں مسلمان ہیں۔ اس کے متعلق ہندو اخباروں نے بھی اور مسلمان اخباروں نے بھی اپنے اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں۔ ہندو خوش ہیں کہ تُرکوں نے فیصلہ کر دیا کہ قومیت پہلے ہے اور مذہب بعد میں۔ اسی طرح ہندوستان میں قومیت کو مقدم رکھنا چاہیئے اور مذہب کو مؤخر سمجھنا چاہیئے۔ اور بعض نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ تُرک مذہب سے بیزار ہیں۔ میرے نزدیک اس جواب کے سمجھنے میں کچھ غلط فہمی ہوئی ہے اور اگر تُرکی وفد سے دوبارہ پوچھ لیا جائے تو مَیں سمجھتا ہوں کہ وہ بھی اس خیال کا اظہار کرے گا کہ ان کا جواب سمجھنے میں ہندوستان کے لوگوں سے غلطی ہوئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض محاورے ایسے ہوتے ہیں جو خاص خاص ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ محاورے ان ممالک کے رہنے والے لوگ تو سمجھتے ہیں لیکن انہی محاوروں کو اگر دوسرے ممالک کے لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے تو وہ ان کو نہیں سمجھ سکتے۔ جس طرح ہر زبان میں بعض محاورے پائے جاتے ہیں اسی طرح بعض قوموں میں یہ دستور اور رواج پڑ جاتا ہے کہ وہ خاص قسم کے محاورات استعمال کرتے اور اُن سے خاص مفہوم مراد لیتے ہیں۔ یہ جو محاورہ ہے کہ مَیں پہلے کیا ہوں اور بعد میں کیا ہوں۔ یہ ہندوستان میں یہاں کی ضرورتوں کی وجہ سے ایجاد کر لیا گیا ہے۔ بیرونی ملکوں میں یہ محاورہ نہیں پایا جاتا اور اس محاورے کا کہ مَیں پہلے ہندوستانی ہوں اور بعد میں ہندو یا پہلے ہندو ہوں اور بعد میں ہندوستانی یا پہلے مسلمان ہوں اور بعد میں ہندوستانی یا پہلے ہندوستانی ہوں اور بعد میں مسلمان۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر یہ دونوں چیزیں آپس میں ٹکرا جائیں تو پھر ہم کس کے پیچھے چلیں گے۔ جو لوگ مذہب کے دلدادہ ہوتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اگر مذہب اور سیاست آپس میں ٹکرا جائے تو ہم مذہب کے پیچھے چلیں گے اور جو لوگ سیاسیات کے دلدادہ ہوتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ مذہب کا سیاست کے ساتھ کیا تعلق؟ اول تو ان دونوں کو ٹکرانا نہیں

چاہیئے لیکن اگر ٹکرا جائیں تو ہم سیاسی عقیدہ کو مذہب پر مقدم رکھیں گے مگر اِس قسم کا جھگڑا اور فساد اور کہیں نہیں۔ ہندوستان میں چونکہ مختلف مذاہب پائے جاتے ہیں اور لوگ آپس میں مذہبی اختلاف کی وجہ سے لڑتے جھگڑتے ہیں اس لئے ہندوستان میں یہ محاورہ نظر آتا ہے کہ تم پہلے کیا ہو اور بعد میں کیا ہو۔ بہرحال جب یہ الفاظ استعمال کئے جائیں گے تو ہندوستان میں اس کے اور معنی لئے جائیں گے اور بیرونی آدمی اس کا اور مفہوم لے گا۔ وہ اگر کہے گا کہ مَیں پہلے تُرک ہوں اور پھر مسلمان تو اس کا مقصد ان الفاظ سے صرف اتنا ہی ہو گا کہ اگر کوئی غیر ملکی جتھا صرف مذہب کی بنیاد پر بنانے کا سوال ہو تو پھر مَیں اس کا حامی ہوں گا یا نہیں۔ یعنی اگر سارے مسلمان بلحاظ مسلمان ہونے کے قطع نظر اس سے کہ ان میں کس قدر اختلافات ہوں آپس میں اشتراک کرنا چاہیں تو ایسی صورت میں مَیں اپنے ملک کے مسلمانوں کے مفاد کا خیال رکھوں گا یا ان کے مفاد کو قربان کرتا ہوًا باہر کے مسلمانوں سے اشتراکِ عمل کر لوں گا۔ یہی احساس عیسائیوں میں بھی رہا ہے۔ چنانچہ کروسیڈز (Crusades) یعنی صلیبی جنگیں اسی خیال کی بناء پر ہوئی ہیں۔

پس میرے نزدیک جب ترکوں سے یہ پوچھا گیا کہ آپ پہلے مسلمان ہیں یا تُرک اور اس کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ ہم پہلے تُرک ہیں اور پھر مسلمان۔ تو اس کا مفہوم محض یہ تھا کہ ہمیں باقی مسلمان قوموں سے بے شک ہمدردی ہے لیکن اگر ہم کسی وقت دیکھیں گے کہ ہماری قوم کو نقصان پہنچنے والا ہے تو اس وقت ہم اپنی جان پہلے بچائیں گے اور دوسروں کا فکر بعد میں کریں گے۔ یہ معنے نہیں تھے کہ ہم تُرک نسل کو مقدّم کریں گے اسلام کو مقدّم نہیں کریں گے کیونکہ وہاں تو کوئی اختلاف ہے ہی نہیں۔ سب لوگ مسلمان ہیں۔ یہ اختلاف تو ہندوستان میں ہی پایا جاتا ہے کیونکہ یہاں مختلف مذاہب کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ تُرک تو سب کے سب مسلمان کہلاتے ہیں۔ اُن کا ذہن ان معنوں کی طرف جا ہی کس طرح سکتا ہے کہ ہم قومیت کو مقدّم کریں گے اور مذہب کو مؤخر کریں گے۔ پس ان کا جواب سیاسی جواب ہے اور یہ سیاسی جواب نیا تو نہیں۔ جب اُن میں خلافت قائم تھی اُس وقت بھی ان کی طرف سے یہی بات پیش کی جاتی تھی اور آج بھی یہی بات پیش کی جاتی ہے۔ یہ عادت تو صرف

ہندوستانیوں میں ہی پائی جاتی ہے کہ وہ دنیا کے ہر جھگڑے میں دخل دینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ جس کا اپنا کوئی گھر نہ ہو وہ ہر گھر کو اپنا گھر سمجھنے لگ جاتا ہے۔ چونکہ ہندوستانیوں کا اپنا کوئی گھر نہیں اس لئے وہ ہر گھر کو اپنا گھر خیال کرنے لگ جاتے ہیں۔ تُرک کسی مشکل میں مبتلا ہوں تو تُرکی لوگ تو اپنے گھروں میں آرام سے بیٹھے ہوں گے مگر ایک ہندوستانی مُلّا یا سیاسی لیڈر کے مُنہ میں ان کی حمایت میں تقریریں کرتے ہوئے جھاگ آ رہی ہو گی۔ عرب کسی ابتلاء میں آئیں تو وہ تو اپنے گھروں میں آرام سے بیٹھے روٹی کھا رہے ہوں گے اور ہندوستان کے مولوی سٹیج پر کود رہے ہوں گے کہ عرب کے لوگ بڑی مصیبت میں مبتلا ہیں ان کی مدد کی جائے۔ یہی حال مصریوں کا ہے۔ مصری اس بات پر غور کر رہے ہوتے ہیں کہ انگریزوں سے سمجھوتہ کر لیں اور ہندوستانی مولوی جس کے پاس تلوار چھوڑ ایک کوڑا تک نہیں ہوتا وہ سٹیج پر ناچ رہا ہوتا ہے اور کہتا ہے ہم اس معاملہ میں کسی صورت میں انگریزوں سے سمجھوتہ نہیں کر سکتے۔ نحاس پاشا1 غور کر رہا ہوتا ہے کہ وہ کس طرح سمجھوتہ کرے اور لاہور کا ایک مولوی جس کا ان امور سے نہ کوئی واسطہ ہوتا ہے، نہ تعلق اور جسے کوئی پوچھتا بھی نہیں وہ یونہی کُودتا پھرتا ہے اور کہتا ہے سمجھوتہ ہرگز نہیں ہو گا۔ تو یہ صرف ہندوستان ہی ہے جس نے اپنے اوپر ساری دنیا کی ذمہ داری سمجھ رکھی ہے۔ باقی ممالک کی یہ حالت نہیں۔ وہ اپنے حالات کو دیکھتے، غور کرتے اور ان سے نتائج اخذ کرتے ہیں اور پھر جیسا موقع ہو ویسا ہی کرتے ہیں۔ مگر ہندوستان کا بے اصولا لیڈر یہ سمجھتا ہے کہ دنیا میں کوئی کام اس کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ صلح اس کے بغیر نہیں ہو سکتی، سمجھوتہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتا، امن اس کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا، ترقی اس کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ وہ سولہ آنے اپنی رائے کو درست سمجھتا اور اپنے بے اصولے پن کو صحیح طریقِ عمل قرار دیتا ہے۔ حالانکہ نہ اسے کوئی اہمیت حاصل ہوتی ہے نہ اس نے دشمن کے پاس جانا ہوتا ہے نہ اس نے لڑائی کرنی ہوتی ہے اور نہ ہی اسے کوئی پوچھتا ہے۔ مگر وہ گھر بیٹھے سولہ آنے اپنی رائے کو درست قرار دے رہا ہوتا ہے۔ ترک بلغاریہ سے لڑتے ہیں اور پھر آپس میں صلح کی شرائط طے کرتے ہیں مگر یہ ہندوستانی گھر بیٹھے شور مچاتے چلے جائیں گے کہ ہم بلغاریوں کو مار ڈالیں گے، انہیں پیس ڈالیں گے اور کبھی ان سے صلح نہیں کریں گے۔

حالانکہ یہ اپنے گھر میں بیٹھا ہؤا ہے اور یہ دشمن پر تلوار اور گولی تو کیا مٹی کی ایک مُٹھی بھی نہیں پھینک سکتا مگر شور مچانے میں سب سے آگے ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں تُرکوں کی یہ حالت ہے کہ جب ہندوستان میں غدر ہؤا تو کہا جاتا ہے کہ انہوں نے انگریزی فوج کو اپنے علاقہ میں سے گزرنے کی اجازت دینے پر آمادگی ظاہر کر دی اور اس بات کی ذرا بھی پرواہ نہ کی کہ یہ فوج ایک مسلمان ہندوستانی حکومت کے مقابلہ کے لئے جائے گی۔ انہوں نے انگریزوں کو لکھ دیا کہ اگر انگریزی فوج کیپ ٹاؤن سے دیر میں پہنچے گی تو ہم اس فوج کے گزرنے کے لئے اپنے ملک سے رستہ دینے کے لئے تیار ہیں اسی طرح فلسطین اور شام میں مسلمانوں سے جو کچھ ہوتا ہے تُرکوں کو اس کا ذرا بھی احساس نہیں ہوتا۔ ہندوستان میں چندے بھی ہوتے ہیں، لیکچر بھی ہوتے ہیں، اخباروں میں مضامین بھی لکھے جاتے ہیں مگر تُرک جو اُن کے ہمسایہ ہیں ان کو کچھ بھی احساس نہیں ہوتا۔ ممکن ہے ان کے دلوں میں کبھی ہمدردی کا کچھ جذبہ بھی پیدا ہوتا ہو اور وہ کہہ دیتے ہوں کہ ہمیں ان تکالیف میں فلاں فلاں علاقہ کے مسلمانوں سے ہمدردی ہے مگر وہ جوش و خروش جو ہندوستان میں پایا جاتا ہے وہ ان میں نظر نہیں آتا۔ تو یہ کوئی نئی بات نہیں۔ تُرک ہمیشہ سے ایسا کرتے چلے آئے ہیں۔ اس لئے ان کا یہ جواب تعجب کا باعث نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح یہ سوال کہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے کیا ہونا چاہیئے مَیں اس کو بھی نہیں چھیڑتا کیونکہ یہ باتیں موجودہ ماحول کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ مثلاً اسلامی نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ دنیا کے تمام مسلمان ایک ہاتھ پر جمع ہوں۔ جب وہ ایک ہاتھ پر جمع ہوں گے تو ایک دوسرے کی مدد کا سوال ہی پیدا نہیں ہو گا۔ اب تو یہ حالت ہے کہ مصر کے مسلمان الگ ہیں، شام کے الگ ہیں، فلسطین کے الگ ہیں عرب کے الگ ہیں، ایران کے الگ ہیں، افغانستان کے الگ ہیں اور جب کسی جگہ کے مسلمانوں کو تکلیف پہنچتی ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ دوسرے مسلمان ان کی کیا مدد کریں گے لیکن جب تُرک اور عرب اور ایران اور فارس سب ایک ہاتھ پر جمع ہو جائیں تو انہیں کہا جائے گا کہ الگ الگ مت رہو بلکہ اکٹھے ہو جاؤ۔ اور جب وہ اکٹھے ہو جائیں گے تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہو گا کہ عرب ایران کی مدد کرتا ہے یا نہیں یا افغانستان تُرکوں کی مدد کرتا ہے یا نہیں۔ کیونکہ وہ سب ایک ہوں گے، الگ الگ نہیں ہوں گے۔ پس جو

کچھ اسلام کہتا ہے اس کا یہاں سوال نہیں بلکہ سوال یہ ہے کہ آج کل مسلمانوں کی جو کچھ حالت ہو گئی ہے اس میں کیا ہونا چاہیئے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ غیر اسلامی حالت ہے۔ ہر قوم اپنے اپنے مفاد کے متعلق ایک پالیسی اختیار کر لیتی ہے اور اس پالیسی کو وہ دوسرے کاموں پر ترجیح دیتی ہے۔ پس جہاں تک آزاد قوموں کا سوال ہے، جن کا گھر ہے وہ لازماً اپنے گھر کی حفاظت کو مقدم سمجھتی ہیں اور دوسروں کے گھروں کی حفاظت کو مؤخر قرار دیتی ہیں اور جن کا اپنا کوئی گھر نہیں وہ ہر قوم سے ہمدردی ظاہر کرتے ہیں جیسے ہندوستانی۔

پس یہ کوئی نیا انکشاف نہیں جس پر ہندوؤں نے شور مچایا ہے۔ مسلمان ایک صدی سے یہ تماشا دیکھتے چلے آئے ہیں۔ اگر اس سے مسلمانوں کی کمزور حالت ثابت ہوتی ہے تو یہ کمزور حالت آج ثابت نہیں ہو رہی۔ آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے بھی یہی حالت تھی اور اس سے کچھ بھی ظاہر نہیں ہوتا تو پھر اس پر رنج کا کون سا مقام ہے۔ ہاں ایک بات ہے جو اہمیت رکھتی ہے اور اگر وہ سچ ہے تو واقع میں افسوسناک ہے۔ اور وہ یہ کہ ایک سوال وفد سے یہ بھی کیا گیا کہ کیا آپ روزانہ نماز ادا کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ سفر میں نماز کیا پڑھنی ہے۔ یہ جواب بتاتا ہے کہ اگر یہ بات سچی ہے تو تُرکوں کا وہ وفد جو ہندوستان میں آیا ہے اس کے دل میں اسلام کی تعلیم نے پوری طرح گھر نہیں کیا۔ ہم اس سے یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ ساری تُرکی قوم ایسی ہے کیونکہ بہر حال یہ چند افراد کا جواب ہے اور وہ اپنے فعل کے آپ ذمہ دار ہیں۔ لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ وہ تُرکوں کے منتخب نمائندے ہیں۔ پس بے شک ان کا فعل ایک قوم کا فعل قرار نہیں دیا جا سکتا مگر چونکہ تُرکوں نے انہیں اپنا نمائندہ منتخب کر کے بھیجا ہے اس لئے یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ تُرکوں کی طرف سے جو نمائندے چُن کر بھیجے گئے ہیں اُن کے دلوں میں نماز کی جو اسلام کے ارکان میں سے ایک بہت بڑا رُکن ہے کوئی عظمت نہیں۔ پس یہ سوال ہے جو درحقیقت اہمیت رکھتا ہے مگر میرے نزدیک اس میں بھی ہندوؤں کے لئے خوش ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

مَیں نے خود ایک دفعہ ایک ہندو اخبار میں یہ لکھا ہوا دیکھا تھا کہ ہمارے ہاں سندھیا یعنی صبح کی عبادت کا جو طریق رائج ہے اس کا ہم میں سے ایک بھی پابند نہیں ہے۔ جس قوم کی

اپنی یہ حالت ہو اور جس قوم کا ایک فرد بھی عبادت کا پابند نہ ہو اسے اس بات پر کیا خوشی ہو سکتی ہے کہ دو کروڑ تُرکوں میں سے چھ تُرک ایسے ہیں جو سفر کی حالت میں نماز نہیں پڑھتے۔ جس قوم کے تیس کروڑ افراد میں سے ایک فرد بھی اپنے مذہب کی بتائی ہوئی عبادت کو نہیں بجا لاتا اسے اس بات کی کیا خوشی ہو سکتی ہے کہ دو کروڑ میں سے چھ شخص ایسے ہیں جو نماز نہیں پڑھتے۔ مگر یہ اعتراض بھی تب ہوتا جب یہ تسلیم کیا جاتا کہ اسلام اپنی عملی صورت میں اس وقت دنیا میں موجود ہے۔ مگر جہاں تک غیر احمدیوں کا سوال ہے وہ بھی یہ نہیں کہتے کہ اسلام اپنی اصل شکل میں دنیا میں موجود ہے۔ اور احمدیوں کا تو سوال ہی نہیں۔ ہمارے تو دعویٰ کی بنیاد ہی اس بات پر ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ نے اس لئے دنیا میں بھیجا ہے تا کہ آپ اسلام کو اس کی اصل شکل و صورت میں پھر قائم کریں۔

پس اگر تُرکوں نے یہ کہا کہ سفر میں نماز کیا پڑھنی ہے تو اس کے معنے صرف اتنے ہیں کہ انہوں نے اپنے اس جواب سے ایک اور تصدیق اس امر کی بہم پہنچا دی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا کی اصلاح کے لئے ضرور کوئی مامور مبعوث ہونا چاہیئے کیونکہ آج خود مسلمانوں کی یہ حالت ہو رہی ہے کہ وہ اسلامی تعلیم پر عمل کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ پس مسلمانوں کو اس جواب پر پریشان ہونے اور گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے گریبانوں میں مُنہ ڈالیں اور سوچیں کہ کیا اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کی نگاہیں خدا تعالیٰ کی طرف اُٹھیں اور اسے پکار کر کہیں کہ الٰہی ہماری حالت کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ہم تیرے رحم کے طالب اور تیرے فضل کے خواستگار ہیں۔ تُو آپ ہمارے دلوں پر روشنی نازل فرما اور ہمیں اپنے نور سے منوّر کر۔ اگر اللہ تعالیٰ کے حضور وہ اس طرح مضطربانہ رنگ میں دعائیں کریں تو اللہ تعالیٰ اُن کی ہدایت کے سامان پیدا کر دے گا کیونکہ واقعہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روشنی تو پیدا کر دی ہے مگر وہ تاریک کونوں میں چُھپے بیٹھے ہیں اور اس نور سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کرتے۔ ایک سَو سال سے زیادہ عرصہ گزرا کہ اسلام کے نام لیوا دنیا کی نگاہوں میں ذلیل ہو گئے تھے اور تمام مسلمان خواہ وہ بڑے ہوں یا چھوٹے، عالِم ہوں یا جاہل، مہذّب ہوں یا غیر مہذّب، تعلیم یافتہ ہوں یا غیر تعلیم یافتہ، سیاسی ہوں یا غیر سیاسی، مشرقی ہوں یا مغربی، کسی ملک اور کسی علاقہ میں

بستے ہوں اُن کے دلوں میں اسلام کی تعلیم کی کوئی عظمت باقی نہیں رہی تھی۔ چنانچہ آج سے پچاس سال پہلے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ تمام نقشہ کھینچ کر رکھ دیا تھا۔ ٹرکی وفد نے کون سی نئی بات بتائی ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا تھا ع

ہر کسے در کارِ خود با دینِ احمدؐ کار نیست 2

ہر شخص کو اپنے اپنے کام سے تعلق ہے مگر رسول کریم ﷺ کے دین سے کسی کو کوئی واسطہ نہیں۔ اسی طرح آپؑ نے فرمایا تھا ع

بیکسے شد دینِ احمدؐ، ہیچ خویش و یار نیست 3

دینِ اسلام بے کس ہو گیا ہے اور کوئی اس کا دوست و مددگار نہیں رہا۔ یہ وہ چیز ہے جسے سلسلہ احمدیہ پچاس سال سے پیش کر رہا ہے اور ہم تسلیم کر چکے ہیں کہ آج مسلمانوں کی یہی حالت ہو رہی ہے۔ پھر اس کو اسلام کی ایک نئی شکست کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ بیماری تو وہ ہے جس کا اعلان آج سے پچاس سال پہلے بلکہ اس سے بھی پہلے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کر دیا تھا۔ پس یہ کوئی نئی بیماری نہیں جو ہمارے سامنے پیش کی جائے۔ دشمنانِ اسلام کو جو کچھ دیکھنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ کیا اس بیماری کے علاج کا کوئی شفاخانہ دنیا میں قائم ہو چکا ہے یا نہیں۔ اگر دنیا میں اس بیماری کے علاج کا شفاخانہ قائم ہو چکا ہے تو پھر اس میں ان کے لئے خوشی کا کون سا موقع ہے۔ آج دوبارہ اسلام کی ترقی کے سامان خدا تعالیٰ نے پیدا کر دیئے ہیں اور دوبارہ اسلام کی بنیادوں کی تعمیر کے لئے قادیان میں اس نے اپنا ایک انجینئر بھیج دیا ہے۔ اس انجینئر نے اسلامی بنیادوں کو مضبوط کر کے اس پر اسلام کے رفیع الشان محل کی عمارت کو کھڑا کرنا شروع کر دیا ہے۔

پس اگر کوئی دشمنِ اسلام اسلام کی گرتی ہوئی بنیاد کو دیکھ رہا ہے تو وہ اُن اُٹھتی ہوئی بنیادوں کو بھی دیکھے جس کے عظیم الشان محل میں دنیا کی تمام پاکیزہ روحوں کو لا کر اکٹھا کر دیا جائے گا۔ اُن کو وہ چھ شکست خوردہ ذہنیت کے مالک مسلمان نظر آتے ہیں مگر وہ یہ نہیں دیکھتے کہ اُن کے گھروں کے سامنے خدا تعالیٰ کی یہ آواز بلند کی جا رہی ہے کہ "میں تیری تبلیغ کو زمین کے کناروں تک پہنچاؤں گا۔" کیا یہ آواز اُن کے کانوں میں نہیں آتی۔ وہ محل جس کی دیواریں

ایک طرف گر رہی ہوں اور دوسری طرف اس کی نئی اور مضبوط دیواریں کھڑی کی جارہی ہوں اس محل کی دیواریں گرنے پر کسی دشمن کو کیا خوشی ہو سکتی ہے۔ اگر ایک طرف اسلام کی کوئی دیوار گر رہی ہے تو دوسری طرف اس کی نئی اور مضبوط دیواریں خدا تعالیٰ کے فضل سے کھڑی کی جارہی ہیں۔ پس دشمن کے لئے خوشی کا کوئی موقع نہیں۔ بے شک یہ ایک کمزوری ہے اور ہم اس کمزوری کو تسلیم کرتے ہیں۔ مگر ہمارے لئے یہ کمزوری کوئی نئی چیز نہیں۔ آج سے تیرہ سَو سال پہلے رسول کریم ﷺ نے اس کی خبر دے دی تھی۔ اور آپ بتا چکے تھے کہ ایک زمانہ میں مسلمانوں کی کیا حالت ہو جائے گی۔

مجھے اس وقت ایک مرحوم دوست کا واقعہ یاد آ گیا۔ مَیں ایک دفعہ دہلی میں گیا ہؤا تھا۔ میری مرحومہ بیوی سارہ بیگم اور میری لڑکی عزیزہ ناصرہ بیگم نے امتحان پاس کیا تھا اور مَیں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ امتحان کے پاس کرنے کے بعد میں تمہیں آگرہ اور دہلی وغیرہ کی سیر کراؤں گا۔ مَیں انہیں دہلی کا قلعہ دکھانے لے گیا۔ جب سیر کرتے کرتے ہم قلعہ کی مسجد کے پاس پہنچے تو میں نے اپنی بیوی اور بچی سے کہا کہ اب تو قلعہ فوج کے قبضہ میں ہے۔ نہ معلوم یہاں خدا تعالیٰ کا ذکر کبھی کسی نے کیا ہے یا نہیں۔ آؤ ہم یہاں نماز پڑھ لیں۔ چنانچہ ہم نے وہاں پانی منگوایا، وضو کیا اور نماز پڑھی۔ میری بیوی اور بچی تو جلدی نماز سے فارغ ہو گئیں مگر میں بہت دیر تک نماز میں مشغول رہا اور دعائیں کرتا رہا۔ جب نماز سے فارغ ہؤا تو مَیں نے دیکھا کہ دو اور عورتیں میری بیوی اور بچی سے باتیں کر رہی ہیں۔ مَیں ایک طرف ہو گیا۔ اس کے بعد میری بیوی میرے پاس آئی اور اس نے بتایا کہ یہ سرحد کی طرف کی عورتیں ہیں۔ ان میں سے ایک کا باپ اور ایک کا چچا بھی ساتھ ہی ہیں۔ اور لڑکی دریافت کرتی ہے کہ میرا باپ اور چچا آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ ان سے مل سکتے ہیں؟ مَیں نے کہا مجھے ان سے ملنے میں کوئی روک نہیں۔ تم ذرا پیچھے ہٹ جاؤ۔ مَیں ٹہلتے ٹہلتے آگے چلا جاتا ہوں اور کچھ دور جا کر ان سے ملاقات کر لیتا ہوں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ لڑکی کہتی ہے ہم نے ابھی نوکر اپنے باپ اور چچا کی طرف بھجوایا ہے اور وہ آپ سے ابھی ملنے کے لئے آتے ہیں۔ چنانچہ مَیں آگے چل پڑا اور میری بیوی اور بچی دوسری مستورات کے ساتھ پیچھے رہیں۔ جب مَیں دیوانِ خاص یا کسی

اور مقام کے قریب پہنچا تو مجھے اپنے پیچھے سے آواز آئی کہ اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ۔ مَیں نے مُڑ کر دیکھا تو دو آدمی کھڑے تھے۔ رسمی گفتگو کے بعد ان میں سے ایک نے کہا کہ میری لڑکی نے کسی طرح آپ کی مستورات کو دیکھ لیا اور گفتگو کے بعد جب اسے معلوم ہؤا کہ آپ قادیان سے آئے ہیں تو اس نے مجھے کہلا بھیجا کہ امام جماعت احمدیہ یہاں آئے ہوئے ہیں آپ ان سے ضرور ملیں۔ اسی وجہ سے مجھے آپ سے ملنے کا خیال پیدا ہؤا۔ مَیں نے کہا لڑکی کو یہ خیال کس طرح پیدا ہؤا۔ اور اس نے آپ کو یہ کس طرح تحریک کر دی کہ آپ مجھ سے ملیں۔ وہ کہنے لگے مَیں چارسدّہ کا ہوں اور میرا بھائی احمدی ہے۔ اور میری یہ لڑکی ان کے لڑکے سے بیاہی ہوئی ہے۔ اس وجہ سے اس کے دل میں تحریک پیدا ہوئی کہ مَیں اپنے باپ سے کہوں کہ وہ بھی آپ سے ملاقات کر لے۔ مَیں نے ان سے کہا کہ چارسدّہ میں خان محمد اکرم خاں صاحب ہمارے ایک احمدی دوست ہیں۔ کہنے لگے وہ میرے بڑے بھائی ہیں اور مَیں اگزیکٹو انجینئر ہوں۔ فقیر محمد خاں میرا نام ہے اور میں ولایت جارہا ہوں۔ میری بیوی اور بیٹی بھی میرے ساتھ ہی ہوں گی۔ کچھ عرصہ وہاں ٹھہرنے کا ارادہ ہے۔ سیر کرنے کے بعد واپس آجائیں گے۔ ان کی طبیعت کچھ مذاقی تھی۔ باتوں باتوں میں ہنس کر کہنے لگے کہ ہم نے اپنے خاندان سے اٹھنّی آپ کو دے دی ہے۔ ہم دو ماؤں سے چار بھائی ہیں۔ ایک ماں کا ایک بیٹا محمد اکرم اور دوسری ماں کا ایک بیٹا غلام سرور یہ تو احمدی ہیں مگر میں اور میرا دوسرا بھائی احمدی نہیں۔ میں نے بھی انہیں مذاقیہ رنگ میں کہا کہ ہمارا سلسلہ اٹھنّی پر راضی نہیں ہوتا۔ ہم تو پورا روپیہ لے کر راضی ہوتے ہیں۔ کہنے لگے محمد اکرم نے مجھے بڑی تبلیغ کی ہے اور مَیں ان کا بڑا ادب بھی کیا کرتا ہوں کیونکہ وہ میرے بڑے بھائی ہیں مجھے ان سے محبت بھی بہت ہے مگر اب تک تو مجھ پر اثر نہیں ہؤا۔ اور مَیں تو اس بات کی ضرورت ہی نہیں سمجھتا کہ اس سوال پر غور کروں کہ دنیا کی اصلاح کے لئے کسی مامور کو آنا چاہیئے یا نہیں۔ مَیں نے کہا آخر بات کیا ہے کہ آپ کی اس طرف توجہ پیدا نہیں ہوتی۔ کیا نبوت کا مسئلہ روک ہے یا کفر و اسلام کے مسئلہ کی وجہ سے طبیعت میں اطمینان پیدا نہیں ہوتا۔ ان کا تعلق سر عبدالقیوم صاحب سے بھی تھا۔ کہنے لگے نبوت کا مسئلہ تو میری راہ میں کوئی روک نہیں۔ سر عبدالقیوم صاحب کی مجلس میں

کئی دفعہ اس موضوع پر گفتگو ہوئی ہے اور مَیں نے ہمیشہ یہی کہا ہے کہ نبوت کا مسئلہ میرے رستہ میں حائل نہیں۔ اگر خدا تعالیٰ کی طرف سے آج دنیا کی اصلاح کے لئے کسی شخص کے آنے کی ضرورت ہے تو پھر نبی بھی آسکتا ہے مگر میں تو اس بات کا قائل ہی نہیں کہ رسول کریم ﷺ کے بعد کسی مصلح کی ضرورت ہے۔ میرے نزدیک آپؐ کے بعد کسی مامور، کسی مصلح اور کسی مدّعی کی حاجت نہیں۔ خیر یہ گفتگو ہوئی اور اس کے بعد وہ چلے گئے۔ تین مہینے گزرے تھے کہ لنڈن سے مجھے ایک خط ملا جس کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی تھی کہ آپ کو یاد ہو گا دو آدمی آپ کو دلّی کے قلعہ میں ملے تھے اور ان میں سے ایک نے آپ سے کہا تھا کہ ہم نے آپ کو روپیہ میں سے اٹھنّی دے دی ہے اور ایک اٹھنّی ہمارے پاس ہے۔ وہ مَیں ہی تھا جس نے یہ الفاظ کہے تھے لیکن آج مَیں لنڈن سے اس خط کے ذریعہ اس بقیہ اٹھنّی میں سے ایک اور چونّی آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں اور اپنے آپ کو آپ کی بیعت میں شامل کرتا ہوں۔ یہ وہی خان صاحب فقیر محمد خاں صاحب تھے، اب فوت ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے لکھا کہ میری احمدیت میں شمولیت کی بھی عجیب صورت ہوئی۔ جب مَیں ہندوستان سے روانہ ہونے لگا تو میرے بھائی صاحب نے زبردستی میرے ٹرنک میں دو تین کتابیں رکھ دیں۔ مَیں نے ان سے کہا بھی ان کتابوں کا کیا فائدہ ہے۔ مَیں وہاں سیر کرنے چلا ہوں کتابیں پڑھنے تو نہیں چلا مگر انہوں نے مانا نہیں اور دو تین کتابیں زبردستی ٹرنک میں رکھ دیں۔ جب اس سفر میں مَیں یورپ کے ملکوں میں سے گزرا اور عیسائیوں کی طاقت، ان کی قوت اور ان کی عظمت و شوکت کو دیکھا تو میرے دل پر مایوسی طاری ہوتی چلی گئی اور مَیں نے کہا کہ اب اسلام کی ترقی کی کوئی صورت باقی نہیں رہی اور کوئی ایسا شاندار مستقبل نہیں جس کی اسلام کے متعلق توقع کی جا سکے۔ انہوں نے لکھا میرے دل پر یہ حالات دیکھ کر اس قدر مایوسی طاری ہوئی کہ مَیں گھبرا گیا اور مَیں نے یقین کر لیا کہ اب ہمارے لئے دنیا میں کوئی ٹھکانا باقی نہیں۔ ہندوستان میں بیٹھے ہوئے تو ہم خیالی پلاؤ پکاتے رہتے اور اپنی ترقی کی خوابیں دیکھتے رہتے ہیں مگر یہاں جو کیفیت دکھائی دے رہی ہے اس کا نتیجہ اسلام اور مسلمانوں کے لئے سوائے موت اور تباہی کے اور کچھ نہیں۔ اسی گھبراہٹ کی حالت میں مَیں نے آپ کی ایک کتاب نکالی اور اسے پڑھنا شروع

کر دیا۔ "دعوۃ الامیر" یا "احمدیت" ان دونوں میں سے کوئی ایک کتاب تھی جس کا انہوں نے ذکر کیا۔ غالباً وہ دعوۃ الامیر ہی تھی۔ جب مَیں نے اس کتاب کو پڑھنا شروع کیا تو اس میں مجھے اس موضوع پر بھی بحث ملی کہ لوگ کہتے ہیں اسلام کے تنزل کا وقت آ گیا مگر وہ ایسا کیونکر کہہ سکتے ہیں جبکہ اس تنزل کی تمام تفصیلات کی خبر آج سے تیرہ سو سال پہلے رسول کریم ﷺ دے چکے ہیں۔ جس شخص نے آج سے تیرہ سو سال پہلے ان تمام واقعات کی خبر دے دی تھی ان واقعات کو دیکھ کر انہیں اس کی شکست قرار دینا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔ اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس شخص کا خدا تعالیٰ سے نہایت پاک تعلق تھا کہ جو باتیں ایک لمبے زمانہ کے بعد رونما ہونے والی تھیں وہ اس نے اپنی روحانی آنکھ سے تیرہ سو سال پہلے دیکھ لیں اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جب اس کی یہ باتیں پوری ہو گئیں تو اس کی وہ باتیں بھی ضرور پوری ہو کر رہیں گی جو اسلام کی ترقی کے متعلق اس کی زبان پر جاری ہوئیں اور جن میں اس نے مسلمانوں کو خوشخبری دی ہے کہ اسلام مغلوب ہونے کے بعد پھر غالب آئے گا۔ پھر کفر کو دنیا سے مٹا دیا جائے گا اور پھر خدائے واحد کی پرستش کو دنیا میں قائم رکھا جائے گا۔ انہوں نے لکھا کہ مَیں جوں جوں ان پیشگوئیوں کو پڑھتا جاتا تھا میری آنکھیں کھلتی جاتی تھیں کہ عیسائیوں کی ترقی کا کیسا صحیح نقشہ رسول کریم ﷺ نے کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ مَیں نے تو آج یورپ میں پھر کر عیسائیوں کی حالت کو دیکھا مگر محمد ﷺ آج سے تیرہ سو سال پہلے رؤیا و کشوف کے ذریعہ یہ تمام حالات دیکھ چکے تھے۔ اس کے بعد جب مَیں نے یہ مضمون پڑھا کہ کس طرح رسول کریم ﷺ نے اس تنزل اور ادبار کے بعد اسلام اور مسلمانوں کی ترقی کی خبر دی ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح اسلام کا دوبارہ احیاء ہو گا تو میرا دل خوشی سے لبریز ہو گیا اور مَیں نے کہا ہمارے لئے اپنے مستقبل سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ ہماری ہی سستی ہے کہ ہم اس کھڑکی میں داخل نہیں ہوتے جو اس آفتاب کی روشنی کے لئے خدا تعالیٰ نے کھول رکھی ہے۔ چنانچہ اس وقت کہ رات کے دو تین بجنے کے قریب ہیں پیشتر اس کے کہ مَیں چارپائی پر لیٹوں مَیں اپنی بیعت کا خط آپ کی طرف بھیج رہا ہوں۔

تو دشمن کے لئے خوش ہونے کا کوئی موقع نہیں۔ اسلام کی دیواریں اگر ایک طرف

گر رہی ہیں تو ساتھ ہی ایک نئی بنیاد اسلام کی ترقی کے لئے اٹھائی جا رہی ہے۔ اگر دشمن یہ دیکھتا ہے کہ محمد ﷺ کے قلعہ میں سے آپ کے نام کی طرف منسوب ہونے والے چند شکست خوردہ لوگ ایک دروازہ سے نکلتے ہوئے اپنے ہتھیار پھینک رہے ہیں تو وہ آنکھیں اٹھا کر دیکھے کہ دوسری طرف ایک اور قوم جس کی رگوں میں جوانی، امید اور امنگوں کا خون تیزی سے دورہ کر رہا ہے فتح کے جھنڈے اڑاتی ہوئی محمد ﷺ کے نام کو بلند کرنے اور اس کی حکومت کو دوبارہ قائم کرنے کے لئے ایک دوسرے دروازے سے محمدی قلعہ میں داخل بھی ہو رہی ہے۔" (الفضل 28 فروری 1943ء)

1. نحاس پاشا: (مصطفیٰ نحاس) مصر کا مشہور سیاسی راہنما۔ سعد زاغلول پاشا کے بعد وفد پارٹی کا سربراہ چُنا گیا۔ کئی بار مصر کا وزیر اعظم رہا۔ 1952ء کے انقلاب کے بعد خانہ نشین ہو گیا (اردو جامع انسائیکلوپیڈیا جلد 2 صفحہ 1713 مطبوعہ لاہور 1988ء)

2،3: درثمین فارسی صفحہ 147 شائع کردہ نظارت اشاعت ربوہ